Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies
Vol. 2, No. 3 (April 2023), pp. 43-49
ISSN (Print): 2958-5112
ISSN (Online): 2958-5120
http://www.ipics.rmrpublishers.org
http://journals.rmrpublishers.org/insights-of-pakistan-iran-and-the-caucasus-studies/

ندیم،ایک مثبت ترقی پسند افسانہ نگار

Dr. Muhammad Tahir Shaheer (Corresponding Author)
Assistant Professor of Urdu, Forman Christian College (Chartered University), Lahore
Email: muhammadtahir@fccollege.edu.pk
Dr. Atiq Anwar
Assistant Professor of Urdu, Forman Christian College (Chartered University), Lahore
Soulat Rehman
Principal at Standard College, Lahore

Publication History:
Received: March 01, 2023
Revised: March 07, 2023
Accepted: March 13, 2023
Published Online: April 01, 2023

Keywords:
Ahmad Nadeem Qasmi,
Taraki Pasand,
Afsana,
Pakistan,
Saadat Hassan Manto,
Soon Sakesar,

Research related to Academic Areas:
Pakistan Studies, Urdu Literature, Languages of Pakistan, Culture of Pakistan,

Acknowledgment:
This paper is a joint academic work of **Authors 01, 02** & **03**.

Ethical Consideration:
This study has no aim to hurt any ideological or social segment but purely based on academic purposes.

Abstract
Ahmad Nadim Qasmi, one of the most popular literary figures of Urdu literature, stands apart amongst his progressive writers for the fact that instead of falling prey to shallow revolutionary aggression, he came up with a mature and composed approach. The canvas of his short stories is very wide, ranging from the exploited farmers to the cruel feudal lords, from pastoral women to urban societies, from oriental norms to changing scenarios, from suppressed corners to oppressive forces, he covers all the segments of our society, behaviors and approaches. However, while throwing light on all these aspects he never gets carried away with emotions. He presents the reality and considering the advocacy approach contrary to the literariness, never tries to bring the reader round to his view point. He paints the pictures and leaves on the readers to draw their own conclusions. This moderate, realistic and objective approach makes him the real representative of the progressive thought.

Copyright © 2023 IPICS Journal as an academic research-oriented non-profit initiative of Rehmat and Maryam Researches (SMC-Pvt) Limited, publishing from Islamabad, Rawalpindi, and Lodhran under the registration from Security and Exchange Commission of Pakistan (SECP). This is an open-access article. However, its distribution and/or reproduction in any medium is subject to the proper citation of the original work.

اردو زبان وادب کے عہد ساز ادیب احمد ندیم قاسمی اس ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں جس کا ہر پہلو فکر و نظر کے نئے در وا کر تا ہے۔انھوں نے بیسویں صدی میں ادب کو خوش سلیقگی سے حقیقت نگاری کا وہ فن سکھایا جسے نابالغ ترقی پسند ادیب افادی ادب کی ضِد سمجھ بیٹھے تھے۔شاعری ہو یا افسانہ، تنقید ہو یا ادبی صحافت، کالم نگاری ہو یا ڈرامہ نگاری، وہ ہر میدان میں زندگی کے مقصدی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے بھی کھوکھلے نعرے بلند کرتے نظر نہیں آتے بلکہ ادبیت ہمیشہ ان کے ملحوظِ خاطر رہتی ہے۔

ندیم نے اس وقت ادب کے میدان میں قدم رکھا جب ترقی پسند تحریک کے لیے فضا ساز گار ہو رہی تھی۔فسوں ساز رومانوی تحریک کا طلسم ٹوٹنے لگا تھا اور ہندوستانی معاشرہ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کو تیار تھا۔

''یہ زمانہ سماجی اور سیاسی تحریکوں کے لیے اس لیے بھی ساز گار تھا کہ عوام اب اپنی جانب دیکھنے پر مائل ہو چکے تھے اور غلامی کا جبہ اُتارنے پر آمادہ تھے۔ روس کے انقلابِ عظیم نے دنیا بھر کے نچلے طبقے کی آنکھیں کھول دی تھیں اور سماجی انصاف اور مساوات ممکن العمل نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ اس دور میں ہندوستان میں جو تحریکیں پیدا ہوئیں اس میں کچلے ہوئے عوام کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ حقیقت نگاری کی تحریک نے زندگی کے اس بدلتے ہوئے دھارے کو خوردبینی نظر سے دیکھا اور اسے بلاواسطہ موضوعِ ادب بنایا۔ بیسویں صدی میں اس کی واضح نمود منشی پریم چند کے ادب میں ہوئی۔''۔(1)

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا تو ہمارے انقلاب پسند ادبا نے یہ فرض کر لیا کہ باغیانہ عناصر، جارحانہ انداز اور زندگی کے اندوہ ناک پہلوؤں کو ان کی تمام تر درشتی کے ساتھ ادب کا حصہ بنانا ہی ترقی پسندیدیت ہے۔ حالانکہ 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے جلسے میں منشی پریم چند کے صدارتی خطبے میں متذکرہ عوامل کے لیے کوئی زیادہ جگہ نہ تھی۔ پریم چند حقیقت پسند ادیب تھے لیکن ان کا ادب صرف جدلی مادیت کا ترجمان نہ تھا۔ صدارتی خطبے کے درج ذیل اقتباسات واضح طور پر اس امر کے عکاس ہیں کہ پریم چند، ادب کو رومانویت کے خیالستانوں سے نکال کر ارضی حقیقتوں کی طرف لانے کے متمنی تو تھے لیکن اس کا یہ مطلب یہ ہر گز نہ تھا کہ کرختگی، درشتی اور تصادم ہی کو ادب کا نام دے دیا جائے:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی۔''(2)

''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرارت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔''(3)

حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرنے کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ تحریروں کے جملے جملے سے شعلے ابل رہے ہوں۔ اسی طرح ان اقتباسات میں جہاں ادب اور زندگی کے تعلق کی بات کی گئی ہے وہیں 'حسن کے جوہر'، ذوق کی صحیح بیداری، روحانی تسکین اور جذبۂ حسن' جیسے عناصر کو بھی مجوزہ ادب کے لیے ضروری گردانا گیا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہمارے ادبا روسی انقلاب کے زیر اثر گویا استحصالی طاقتوں کے خلاف یوں صف آرا ہوئے کہ ادب کا اصل منصب ہی فراموش کر بیٹھے۔

روایتی ترقی پسندوں کے بر عکس احمد ندیم قاسمی نے میدانِ ادب میں قدم رکھا تو کھوکھلی نعرے بازی کے بجائے ادب کی صحت مند روایت کا دامن تھاما۔ یوں تو ندیم کی شاعری اور نثر دونوں اس حقیقت کے غماز ہیں لیکن اس مقالے کا دائرہ کار ندیم کی افسانہ نویسی تک محدود رکھا گیا ہے جس میں وہ ہر لحہ اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہمارے معاشرے کے متوسط طبقات بالخصوص دیہی آبادیوں کے قصے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ابتدائی تحریروں میں ندیم کے ہاں بھی جارحانہ انداز اور درشتی نظر آتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ترقی پسند فکر کے اصل مفہوم کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

غور کیا جائے تو ترقی پسند تحریک کے کٹر انقلابی گروہوں کے بر عکس ندیم کے افسانے پریم چند کے بیان کردہ نظریۂ فن کے قریب تر ہیں۔ دونوں عظیم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ بھی یہی حقیقت سامنے لاتا ہے کہ پریم چند اور احمد ندیم قاسمی ایک ہی سلسلے کی ارتقائی کڑیاں ہیں۔ دونوں کو اپنی ثقافت اور اپنے تہذیبی ورثے سے والہانہ لگاؤ تھا اور دونوں کی نظریں بالعموم عوام کے متوسط طبقے پر ہی ٹھہرتی تھیں۔

البتہ ایک خالص تخلیقی ادیب ہونے کے ناطے ندیم نے اپنے افسانوں کو کبھی پریم چند کے افسانوں کا چربہ نہیں بننے دیا۔ دونوں افسانہ نگاروں کی تحریروں میں مماثلت کے باوجود یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ ندیم کے افسانے پریم چند کے پیش کردہ ادب کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ سید وقار عظیم نے درست کہا تھا:

''پریم چند کے سیکڑوں افسانے پڑھنے کے بعد بھی احمد ندیم قاسمی کا ہر افسانہ ہمارے لیے نئی زندگی اور نئے ماحول کا پیامی ہے۔''(4)

پریم چند اور ندیم کے افسانوں میں مماثلت کا اہم ترین سبب دونوں کی تحریروں میں پائے جانے والے طبقات ہیں۔ پریم چند بھی دیہی پس منظر میں لکھنا پسند کرتے تھے اور احمد ندیم قاسمی کو بھی اپنے گردوپیش کے ماحول سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ پریم چند بھی اسلوبیاتی مشکل پسندی پر آسان روی کو ترجیح دیتے تھے اور ندیم بھی اسی نظریۂ فن کے حامی تھے۔ پریم چند بھی حقیقت نگاری کے آرزو مند تھے اور ندیم نے بھی اپنے فن کی بنیاد حقیقت نگاری پر رکھی۔ یہی وہ اشتراکات ہیں جو پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لے آتے ہیں۔ تاہم ڈاکٹر انور سدید دونوں عظیم افسانہ نویسوں کا موازنہ کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ ندیم کا فن پریم چند کے فن سے ایک قدم آگے بھی تھا اور اپنے چند امتیازات کے باوصف انفرادیت کا حامل بھی۔ فاضل ادبی مورخ اور نقاد کا کہنا ہے:

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

''پریم چند کے دیہات میں سادگی ہے، ندیم کے دیہات میں تخلیقی مبالغے کا پرتو ہے۔ پریم چند کے کردار باتیں کرتے ہیں، ندیم کے کردار تقریریں کرتے ہیں۔ پریم چند کے کردار محنت کش ہیں اور تقدیر کو بدلنے کے لیے قوت استعمال کرتے ہیں، نندیم کے کردار سستے طریقوں سے دولت حاصل کرنے کے طریقے سوچتے ہیں اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی قوت عمل میں کم لاتے ہیں۔ پریم چند کے کردار قاری کو ہلاڈالتے ہیں اور اسے اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں، ندیم کے کردار روتے ہیں، بلبلاتے ہیں اور رحم کے جذبوں کو خارجی وسیلے سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پریم چند کے ہاں کفایتِ لفظی ہے اور ندیم کے ہاں طوالت اور پھیلاؤ۔ مجموعی طور پر پریم چند کے افسانے شدتِ تاثر پیدا کرتے ہیں اور اس کی سادگی میں بھی پُرکاری نظر آتی ہے مگر ندیم کے افسانے رِقّت پیدا کرتے ہیں اور اس کی آرائش میں بھی تصنع نظر آتا ہے۔''(5)

ڈاکٹر موصوف کی رائے کی روشنی میں ہم باآسانی کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند جس افسانوی روایت کے نقطۂ آغاز پر نظر آتے ہیں، احمد ندیم قاسمی اسی روایت کے دورِ عروج کے نقاش ہیں۔ موضوعی حوالے سے پریم چند کے دیہات اور ان کے باسی اس زوال یافتہ معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جو غم واندوہ سہتے سہتے تھک کر پھر سے بیدار ہو رہا تھا اور قاسمی کے کردار از سرِ نو زوال آمادہ معاشرے کے عکاس ہیں۔ پریم چند کے افسانوں کی دنیا اپنی منفی روایات کی زنجیریں توڑ دینا چاہتی تھی جبکہ قاسمی کے عہد کے لوگ منفی معاشرتی اقدار کا شکار بھی ہیں اور ان میں اس بھنور سے نکلنے کی سکت بھی نہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے طویل زندگی پائی۔ ان کی زندگی کا یہ سفر متنوع تجربات و مشاہدات سے بھرپور تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے وقت تو انھوں نے ہوش بھی نہ سنبھالا ہو گا لیکن اس کے اثرات ظاہر ہونے تک وہ لڑکپن میں قدم رکھ چکے تھے۔ پھر دوسری جنگِ عظیم کا سانحہ ہوا تو نوجوان ندیم کی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی تھی، ان کا قلم اسے صفحۂ قرطاس پر اتارنے کے قابل بھی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد تقسیمِ ہند، پھر آسوں، امیدوں کا ٹوٹنا، پھر اظہارِ رائے پر پہرے، اور پھر سقوطِ ڈھاکا۔ اس بدترین سانحے کے بعد بھی گردشِ زمانہ بھی جاری رہی اور ندیم کا سفرِ زیست بھی۔ مختصر جمہوری دور کے بعد ایک بار پھر آمریت، پھر ہانپتی ہوئی نام نہاد عوامی حکومتیں اور پھر ایک اور مارشل لا۔۔۔ ایسے میں ندیم جیسے تخلیقی آدمی کے مشاہدے اور تجربے کا وسیع تر ہونا ایک فطری امر تھا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ زیادہ لکھنے کے باوجود ان کے افسانوں میں یک رنگی نہ آئی۔ تنوع اور دھنک رنگی ان کے سادہ مگر متاثر کن قصوں کو پُرکشش بناتی رہی۔ سید وقار عظیم نے بجا طور پر کہا ہے:

''قاسمی کے افسانوں میں۔۔۔ سب سے زیادہ دخل اس کے اس انہاک کو ہے جس کا عکس اس کے مشاہدے، مطالعے، فکر اور بیان ہر چیز سے نمایاں ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے۔۔۔ موضوعِ فن اور شخصیت کی ہم آہنگی کے مظہر بھی ہیں اور فنی انہاک، توجہ اور حسنِ بیان کے حسین پیکر بھی۔
(6)''

یہ انہاک، سنجیدگی، توجہ، ارتکاز، حسنِ بیان اور فن کاری ہر کس و ناقص کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس کے لیے خواہ کیسی ہی ریاضت کر لی جائے، کامیابی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ فطری طور پر ادیب میں تخلیقیت نہ پائی جاتی ہو۔ نہ صرف ندیم کی تحریروں سے تخلیقیت چھلکتی نظر آتی ہے بلکہ اہم ترین بات یہ ہے کہ انھیں اپنے تخلیقی جوہر کا خود بھی بخوبی علم تھا جس کا اظہار کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں:

''میری شاعری کو افسانہ نگاری اور افسانہ نگاری کو شاعری نے نکھارا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ میں صرف شاعر اور افسانہ نگار ہی کیوں ہوں، ساتھ ہی مصور، مغنی اور مجسمہ ساز کیوں نہیں ہوں۔ میرے اندر تو تخلیقِ فن کا لاوا اُبل رہا ہے''۔(7)

قابلِ صد تعریف بات یہ ہے کہ تخلیقِ فن کے ابلتے ہوئے اس لاوے کو ندیم نے اسپِ بے مہار کی طرح نہیں چھوڑا بلکہ اپنی طبیعت کے ٹھہراؤ اور سنجیدگی کی بھٹی سے گزار کر ایسی تحریریں قارئین تک پہنچائیں جن میں انھیں اپنے معاشرے کا عکس بھی نظر آتا ہے، اپنی منفی روایات پر تنقید بھی ملتی ہے، حقیقت کے پرتو بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن کہیں بھی افسانہ نگار کھوکھلی جذباتیت کا شکار نہیں ہوتا۔ حالانکہ جس نوعیت کے تلخ تجربات اور مشاہدات کا سامنا احمد ندیم قاسمی کو رہا، شاید وہ بھی باآسانی سعادت حسن منٹو کی طرح برہنہ حقیقت نگاری پر اتر سکتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

''۔۔۔ میں نے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے آہوں کے دھوئیں اٹھتے دیکھے ہیں۔ میں نے موت کی چڑیلوں کو تیرہ نصیب مریضوں کے سرہانے دانت کچکچاتے اور انگلیاں چٹخاتے دیکھا ہے۔ میں نے زندگی کی نعش کو گلتے سڑتے دیکھا ہے۔ میں نے۔۔۔ گرد آلود پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسوؤں کو۔۔۔ غریبوں کی اس روتی اور بلکتی ہوئی اولاد کو نہائت قریب سے دیکھا ہے جس کی دھجیوں سے بدبو آتی ہے۔''۔(8)

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

احمد ندیم قاسمی نے سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے نہ صرف اپنے افسانوں میں دیہی رہن سہن، طبقاتی تضاد، سماج کے پسے ہوئے استحصالی طبقات اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو موضوع بنایا بلکہ سیاست اور مذہب کے ٹھیکے دار بھی جو اپنے مفاد کے لیے دوسروں کا استحصال کرتے ہیں ان کے قلم کی زد سے بچ نہ پائے۔ اسی طرح ہمارے تیزی سے بدلتے ہوئے رویے، اخلاقی اقدار کا زوال، انسان کا کھوکھلا پڑتا ہوا باطن، نفسیاتی الجھنیں، عہد جدید میں بڑھتا ہوا عالمگیر احساس تنہائی اور اس کے نتیجے میں مرتی ہوئی انفرادیت، سب کچھ ندیم کے افسانوں کا موضوع رہا۔ تاہم کسی بھی موقع پر عظیم افسانہ نگار نے تدبر، ٹھہراؤ، سنجیدگی اور متانت کا دامن نہیں چھوڑا۔ اسی لیے انھیں صحیح معنوں میں سچا اور حقیقی ترقی پسند افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے؛ وہ ترقی پسند جو ادب میں مقصدیت کا قائل تھا لیکن ادب اور تجارت کا فرق خوب جانتا تھا؛ جو مثبت اقدار کے فروغ اور منفی رویوں کی تنسیخ کرکے تبدیلی کا خواہش مند تو تھا؛ لیکن انقلاب کے بدمست نشے میں سب کچھ تہ و بالا کر دینا اس کا مطمح نظر نہ تھا؛ جسے حقیقت سے پیار تو تھا لیکن وہ رومانوی اظہاریے اور شگفتگی خیال کا انکاری نہیں تھا۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو ندیم کو ایک حقیقی اور مدبر ترقی پسند بنا دیتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا تعلق سون سکیسر کے قریب ایک گاؤں ''انگا'' سے تھا۔ خوب صورت وادیوں کا یہ گاؤں اب تحصیل خوشاب، ضلع سرگودھا کا حصہ ہے۔ یوں تو ندیم کے افسانوں میں گاؤں کے ماحول کی عکاسی جابجا دیکھی جاسکتی ہے لیکن اپنی جنم بھومی ہونے کے باعث ندیم کو سون سکیسر سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کا بیان یوں تو ان کے مختلف افسانوں میں ملتا ہے لیکن درج ذیل سطور میں سکیسر کا دل موہ لینے والا تعارف دیکھیے:

> ''یہ رئیس خانہ کوہستانِ نمک کی سب سے اونچی چوٹی، سکیسر پر تھا۔ سردیوں میں یہ پہاڑ بادلوں اور دھندلکوں میں لپٹا پڑا رہتا۔ دور سے یوں نظر آتا کہ جیسے کوئی بڈھا مہینوں سے نہایا نہیں ہے۔ یہاں کی چوٹیوں اور نشیبوں میں بکھرے ہوئے بنگلوں کی چمنیوں پر الّو بولتے اور منڈیروں پر بلیاں لڑتیں۔۔۔۔ جب نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی اور اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا اور پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اٹھتے تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی۔''(9)

سکیسر کا یہ تعارف ایک طرف تو ادبی حوالے سے خوبصورت منظر کشی کی عمدہ مثال ہے اور دوسری طرف غور کیا جائے تو ندیم نے ہمارے ایک اہم سیاحتی مقام کی متاثر کن مرقع کشی کرکے جانے کتنے ہی سیاحوں کو سکیسر کی طرف متوجہ کیا ہے۔ یہ ادب کے افادی استعمال کا بہترین نمونہ نہیں تو اور کیا ہے۔ ادب کا مقصدی وظیفہ بھی پورا ہو جاتا ہے اور طبعِ حساس کی تسکین بھی۔

چونکہ ندیم نے پنجاب کی دیہی زندگی کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا اور ذاتی طور پر انھیں دیہی ماحول سے بہت لگاؤ بھی تھا اس لیے ان کے مختلف افسانوں میں دیہی زندگی کی انتہائی بہترین مرقع کشی ملتی ہے۔ یہاں بھی وہ ایک سنجیدہ ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے گاؤں کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ کبھی دیہات میں پانی بھر کر لاتی ہوئی دوشیزائیں ہیں اور کہیں محنت کش جوان، کہیں مدبر اور سنجیدہ بزرگ ہیں تو کہیں مغرور چوھدری، کہیں پسے ہوئے کسان ہیں تو کہیں خوش حال جاگیر دار، کہیں لالچی کاروباری ہیں اور کہیں دیانت دار ملازمین، گویا معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے دیہاتی ندیم کے افسانوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ندیم کسی بھی موقع پر ترقی پسند فکر کو ادبی منصب پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ متذکرہ تمام کرداروں کی مرقع کشی پر مکمل جزیات کے ساتھ توجہ دیتے ہیں جس سے صرف کردار کا طبقہ نہیں، کردار کی شخصیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ درج ذیل مرقعے ندیم کے دیہی کرداروں کی عمدہ تصویریں ہیں جن میں کرداروں کے دیہی رویے اور فیشن بھی سامنے آجاتے ہیں:

> ''دھاری دار بوسکی کُرتے میں سیپ کے بٹنوں کی بجائے چاندی کی زنجیر لٹکا رکھی تھی۔''(10)

> ''سات رنگوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اس کے تہ بند، کُرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے۔''(11)

اسی طرح دیہاتیوں کا اخلاص اور اخلاقی اقدار کا پرچار بھی ندیم کے افسانوں کا محبوب موضوع تھا۔ اس حوالے سے وہ اصلاحی افسانہ نگار کا روپ نہیں دھارتے، یعنی ان کے افسانے اخلاقی اقدار کا درس دیتے نظر نہیں آتے البتہ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے بتا جاتے ہیں کہ پنجاب کے دیہات میں لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے اور وہ ایک دوسرے سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ افسانہ ''ہرجائی'' کی خاتون اور افسانہ ''طلوع و غروب'' کی سنبل کے لہجے میں پائی جانے والی روایتی مشرقی مہمان نوازی کی جھلک ملاحظہ کیجیے:

> ''روزانہ چھاچھ پی جایا کرو بیٹا! تیرا اپنا گھر ہے۔''(12)

> ''آپ میری آنکھوں میں رہیے، میرا گھر، آپ کا گھر ہے، شوق سے تشریف لائیے!''(13)

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

جہاں وہ دیہاتی ماحول اور وہاں کے باسیوں کی عادات و خصائل کی عکاسی کرتے ہیں وہیں بالائی اور زیریں طبقات کے حالات اور آپسی تصادم کو بھی موضوعِ تحریر بناتے ہیں۔ یہاں ایک سچے ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے وہ ایسے جرأت مند کردار بھی گھڑتے ہیں جو وقت کے جابروں کے سامنے سر اٹھانا بھی جانتے ہیں۔ ذیل کی مثال واضح طور پر اس امر کی عکاس ہے کہ ندیم اپنے دیہات کے کسانوں اور محنت کشوں کو جرأت مند دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف گاؤں کے وہ چوھدری ہیں جو ہر لمحہ یہی خواہش رکھتے ہیں کہ ان کے زیرِ نگیں رہنے والے انھی کے حکم پر لبیک کہیں۔ گاؤں کے جاگیر دار اور اس کے مزارع کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ دیکھیے:

''ہل، روک لو۔''

ہل، نہیں رکے گا۔ ہل، رکنے کے لیے پیدا نہیں ہوا، ہل چلتا رہے گا۔ ہل اناج کا خالق ہے، ہل خدا کا اشارہ ہے۔''

''میں کہتا ہوں روک لو ہل، سور کے بچے!!''(14)

قاسمی کے افسانے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انھیں یہ احساس بہت شدت سے تھا کہ لوگ بہت تیزی سے اپنی روایات کو ترک کرتے جا رہے ہیں۔ یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ تمام آرام، سکون، تہذیب اور شائستگی شہری زندگی سے عبارت ہے۔ اس لیے لوگ تیزی سے شہروں کی طرف ہجرت کرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح ذرائع ابلاغ نے دیہاتیوں کو بھی شہری زندگی کی چاٹ لگا دی ہے اس لیے وہ بھی اب شہری طور طریقوں پر ہی فخر کرنے لگے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

''گاؤں میں آکر کیا کریں؟ مٹی کے برتنوں کا رواج اٹھ رہا ہے، ہم خود چینی کے برتنوں میں چائے پیتے ہیں۔'(15')

تو وہ متذکرہ بدلاؤ کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور اس پر افسوس کا اظہار بھی کر جاتے ہیں۔ کسی بھی تنقیدی مرحلے پر ندیم بلاواسطہ سخت انداز اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ کبھی طنز کے پیرائے میں اور کبھی اپنے شگفتہ اسلوب کی تخلیقیت سے تنقیدی نقطے کو بھی نہایت لطیف مگر متاثر کن انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً افسانہ ''میں انسان ہوں'' میں انسانی حالتِ زار بیان کرنے کے لیے کی گئی تکرارِ لفظی انتہائی متاثر کن ہے:

''آج ساری انسانیت پیاسی ہے، میں بھی انسان ہوں، اس لیے میں بھی پیاسا ہوں۔۔۔۔ اور میں زمین پر پڑا ہوں اس لیے کہ میری بنیادیں کمزور تھیں، اس لیے کہ میں انسان ہوں۔۔۔ اور میں پیاسا ہوں''۔(16)

انسان کی یہ حالت اور نہ ختم ہونے والی پیاس دراصل طنز ہے ہمارے ان منفی رویوں پر جن کے نتیجے میں کل کا مسجودِ ملائک آج قابلِ ترس تشنہ لبی کا شکار ہے۔ غور کیا جائے تو انسان کی اس حالت کی تصویر کشی کر کے ندیم ہمارے معاشرے کے اس زیریں طبقات کی حالتِ زار پر اظہارِ افسوس کر رہے ہیں جس کے حصے میں شکست، ناآسودگی، محرومی، تحقیر اور پیاس ہی آتی ہے۔ تاہم سطحی ترقی پسند کی طرح ندیم اس موقع پر بھی جھنجھلاہٹ کا شکار نہیں ہوتے بلکہ انسان کی اس تلخ حقیقت کے شگفتہ بیانیے کے لیے تکرارِ لفظی کی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی بات کو اثر آفریں بھی بناتے ہیں اور حقیقت نگاری کا فرض بھی نباہ جاتے ہیں۔

ندیم کے افسانوں کا اہم ترین وصف یہ ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے روایتی انقلاب پسندوں کی طرح ہر وقت منفی حقائق کی تصویر کشی کر کے صورتِ حال کو یکسر بدل دینے کی بات نہیں کرتے بلکہ دانائے راز کی طرح اپنے افسانے میں بیان کردہ کہانی کے ذریعے صورتِ حال اپنے قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور خود کسی بات کا پرچار نہیں کرتے۔ اب یہ قاری پر ہے کہ وہ کسی صورتِ حال پر کیسا ردِ عمل کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ ندیم اپنے قارئین کو انقلاب اور بدلاؤ پر اکساتے نہیں ہیں بلکہ انھیں صورتِ حال کا موثر ادراک کروا کر شعوری طور پر تبدیلی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ایک صحت مند ترقی پسند ادیب کا یہی منصب ہے۔ درج ذیل اقتباسات اسی حقیقت کے عکاس ہیں:

(جب عبداللہ بھیک مانگ کر چار آنے اور چار روٹیاں لے کر کپکپاتا ہوا اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے تو وہ کہتی ہے)

''کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے پہلے تم خون پسینہ بیچ کر روٹی لیتے تھے۔ جھگڑا تو روٹی ہی کا ہے ناں!!!''(17)

''مستقبل میرا یا تمھارا نہیں، چراغ کا ہے۔ ہم تو وقت کے ریلے میں بہتے ہوئے سسکتے ہیں۔ ہوا کے بہاؤ میں گھرے ہوئے، کوئل کے نوچے ہوئے پَر ہیں۔''(18)

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

دونوں اقتباسات ہماری تلخ حقیقتوں کے شارح ہیں۔ پہلا اقتباس اس امر کا غماز ہے کہ ہمارے استحصال زدہ معاشرے میں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اچھے خاصے محنت کش بھی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور مفلسینِ شہر دو وقت کی روٹی کے لیے کبھی خون پسینہ بہاتے ہیں اور کبھی آنسو۔ جبکہ دوسرا اقتباس اس امر پر دال ہے کہ منتظر فردا رہنے والے کبھی اپنا مستقبل نہیں بدل پاتے۔ خوشیوں کی صبحِ درخشاں انھی چراغ صفت لوگوں ہی کو ملتی ہے جو جدوجہد کی آگ میں جلنا جانتے ہیں۔ یوں ندیم ہلکے پھلکے انداز میں عہدِ حاضر پر تنقید بھی کرتے ہیں اور کوشش کا درس بھی دیتے ہیں لیکن کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دینے کی بات نہیں کرتے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا ایک اہم موضوع تقسیمِ ہند کے وقت ہونے والے فسادات ہیں، جن کے پس منظر میں ظلم و جبر، انسانیت کی تذلیل، پست انسانی ذہنیت اور بربریت کی کہانیاں ہیں۔ اردو کے تقریبًا سبھی بڑے افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر لکھا۔ مگر بیشتر لکھاریوں نے تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھایا۔ پاکستانی ادیبوں نے سکھوں اور ہندوؤں کے ظلم و تشدد کو تحریر کیا اور ہندوستانی لکھاریوں نے مسلمانوں کی بربریت کو موضوع بنایا۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کے اس پس منظر میں لکھے گئے افسانے اپنی غیر جانبداری کی وجہ سے اہم ہیں۔ انھیں ادراک تھا کہ کسی بھی قوم یا مذہب کے لوگ ایسے حالات میں مشتعل ہو سکتے ہیں۔ اچھے برے لوگ سماج کے تمام طبقوں میں ہوتے ہیں اور انسان کی محرومیاں، ناکامیاں یا نفسیات ایسے سانحوں کا سبب بنتی ہیں۔ اپنی حب الوطنی کے باوجود انہوں نے فسادات کے موضوع پر لکھتے ہوئے جذباتیت کو خود پر غالب نہیں آنے دیا اور ایک بڑے ادیب کے طور پر اپنے فرائض سے منہ نہ موڑا۔ ''پشاور ایکسپریس'' اور ''پرمیشر سنگھ'' اس حوالے سے ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

ندیم کے نظریۂ فن کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ وہ ادب میں مقصدیت کے قائل تھے لیکن فن کو مقصد پر قربان کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں ان کے افسانوں میں تلخ حقائق کا بے لاگ بیان ملتا ہے وہیں وہ کائنات کی وسعتوں، فطرت کی رنگینیوں اور حسن و جمال کے مرقعوں سے اپنے افسانے مزین کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ دیہاتی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ وہ دیہات کی صبحوں، شاموں اور شفاف راتوں کی مصوری بھی خوب کرتے تھے۔ درج ذیل اقتباسات واضح طور پر اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ندیم نے مارکسیت زدہ ترقی پسندیدیت کے عہد میں آنکھ ضرور کھولی لیکن ان کا صحت منداحساسِ جمال انھیں فطرت کی حسن کاریوں سے بیگانہ نہیں کرتا تھا:

> ''اور تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل جمے ہوئے ٹنڈ منڈ بیریوں کے آبنوسی سایوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی جس کے ٹخنوں سے لپٹی جھانجھنے ہر قدم پر ایک دل آویز جھنا کہ پیدا کرتی ہیں، جس کی ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل ہے، اپنی پیلی چھینٹ کے لہنگے سے اس کے زخم دھو رہی ہے۔''(19)

> ''زرد چاند دور مغرب میں افق کے قریب اونگھ رہا تھا اور موٹے موٹے ستارے سلیٹی آسمان پر ناچ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آگئی تھی۔۔۔ ٹیلوں کی ٹھنڈی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی تھی۔۔۔۔ صبح کا ستارہ مشرقی افق پر کسی سانولی دلہن کے ماتھے کی طرح چمک رہا تھا۔''(20)

یوں احمد ندیم قاسمی کے افسانے جیتی جاگتی زندگی کے متحرک مرقعے بن گئے۔ قاسمی نے وابستگیوں کے اس عہد میں ادبی میدان میں قدم رکھا جب عدم وابستگی کی صورت میں مرکزی دھارے میں رہنا ممکن نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک اس وقت اپنے جوبن پر تھی اس لیے قاسمی صاحب بھی اس کا حصہ بن گئے۔ البتہ کچھ عرصہ بعد جب انھیں احساس ہوا کہ اس وابستگی کے نتیجے میں تو شاید ایک روز انھیں اپنے نظریۂ فن سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا تو انھوں نے ترقی پسند تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور صرف ان رجحانات کو اپنائے رکھا جن کا تعلق فرد کے تشخص، اور اجتماعی مسرت سے تھا۔ انھوں نے کھوکھلی حقیقت نگاری پر پُر تاثیر مقصدیت کو ترجیح دی اور سماج میں طبقاتی کشمکش اور جدلی مادیت کے بجائے طبقاتی تضاد اور معاشی ناہمواریوں کو موضوع بنایا۔ وہ نہ تو اشتہاری ادب کے قائل تھے اور نہ ہی ان کے افسانوں میں سے کسی ایک پر بھی یہ الزام دھرا جا سکتا ہے۔ وہ اس آشوب انگیز دور کے ادیب تھے جس میں چہار سُو محرومیاں، غم و اندوہ، استحصال، حرص و ہَوس، نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصب، مفاد پرستی اور انا پرستی کی چنگاریاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہمیں آج بھی ایسے ہی حالات کا سامنا ہے اور ندیم نے ہماری زندگیوں کے ایسے ہی مختلف پہلو ہمارے سامنے رکھ دیے۔

> ''انسان پاکستان جیسے ملک میں زیست کرتا ہو، جہاں جھوٹ، فریب، مکاری، منافقت سکہ رائج الوقت ہوں، جہاں کے اعلیٰ حکمران فرعون اور سیاست دان منڈی کا مال ہوں اور جہاں بھینس صرف لاٹھی والے کی ہو، اور ان سب پر مستزاد جبر و استبداد کا ماحول اور قدغنوں کا چلن! مگر احمد ندیم قاسمی نے کبھی بھی مایوسی یا قنوطیت کا اظہار نہ کیا، نہ عملی زندگی میں نہ ہی اپنی عملی تخلیقات میں۔''(21)

ان کی شخصیت کا یہی پہلو انھیں ایک کھرا، سچا، معتدل اور حقیقی ترقی پسند ادیب بنا دیتا ہے۔

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

حوالہ جات

1. انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، دہلی: کتابی دنیا، 2004، ص464-465
2. بحوالہ سجاد ظہیر، روشنائی، منیر کا: سیماب پبلی کیشنز، 1985، ص112
3. ایضاً، ص16
4. وقار عظیم، سید، نیا افسانہ، علی گڑھ: ایجو کیشنل بک ہاؤس، 1990، ص166
5. انور سدید، فکر و خیال، سرگودھا، مکتبہ اُردو زبان، 1986، ص24
6. وقار عظیم سید، داستان سے افسانے تک، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 2007، ص351
7. خلیق احمد خلیق، ''یادگار انٹرویو''، (مشمولہ)، افکار (ندیم نمبر)، کراچی: جلد30، شمارہ58، جنوری فروری1975، ص267
8. قاسمی، احمد ندیم، طلوع و غروب، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 1995، ص12
9. قاسمی، احمد ندیم، سناٹا، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 1995، ص26
10. قاسمی، احمد ندیم، کپاس کا پھول، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 1995، ص9
11. ایضاً، ص252
12. قاسمی، احمد ندیم، چوپال، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 1995، ص8
13. قاسمی، احمد ندیم، طلوع و غروب، ص30
14. قاسمی، احمد ندیم، آبلے، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 1995، ص63-64
15. قاسمی، احمد ندیم، برگِ حنا، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 1995، ص24
16. قاسمی، احمد ندیم، در و دیوار، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 1995، ص10-11
17. قاسمی، احمد ندیم، کپاس کا پھول، ص84
18. قاسمی، احمد ندیم، در و دیوار، لاہور: ص108-109
19. قاسمی، احمد ندیم، بگولے، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 1995، ص32-33
20. قاسمی، احمد ندیم، طلوع و غروب، ص45
21. سلیم اختر، ڈاکٹر، ''احمد ندیم قاسمی، تخلیقی شخصیت''، (مشمولہ)، سہ ماہی مونتاج، لاہور: شمارہ1، جنوری تا اپریل2007ء، ص75

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)